ترجمۃ القرآن از عبد السلام بن محمد کے خصائص و ممیّزات اور تفسیر القرآن الکریم کا تحقیقی مطالعہ (حصہ دوم)

Characteristics & Qualities of Translation by ‘Abdul Salām Ibn Muḥammad and Research Study on Tafsīr al-Qur’ān al-Karīm (Part: 02)

*ڈاکٹر یاسر فاروق

Abstract

Since the revealing of holy quran, many scholars paid lot of services to convey Allah almighty's message regarding his teachings to human being. Many scholars wrote Quranic exegesis and interpretations, while the other hand hundreds of people translated it into other languages so that people may be able to learn its teaching according to their languages. In sub-continent, shah wali ullah and his sons got primary position by contributing in this regard. They translated holy quran first time in Urdu and Persian. This was the time of need to translate it. After them, a chain of translations and interpretation has been recognized. All of these had many features & characteristics but the translation and interpretation of Abdul Salam bin Muhammad, which we are presenting in this research are more valuable and much better then all. In his translation he secured a huge attention by scholars of Pakistan. Because his translation has many qualities and features i.e. accuracy of meaning, exact meaning of Arabic word, meaning of silent word from text, idiomatic translation, sequence of meaning etc. His interpretation of Quran also has many characteristics and features which highlights it among many other interpretations. In this paper, we've presented a research on the methodology of his great translation & interpretations along with their features and qualities.

***Keywords**: translation, tafsir ul Quran al Karim, Abdul Salam bin Muhammad, Sub-continent, idiomatic.*

تعارف

قرآنِ مجید کی تفسیر جہاں نہایت ہی بابرکت و مقدس فریضہ ہے وہیں حد درجہ احتیاط کا متقاضی امر بھی ہے۔ مفسّر کے لیے جو شروط و آداب لازم قرار دیے گئے ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل مقصود بہا امر یہ ہے کہ قرآن کا جو بھی مفہوم متعین کیا جائے وہ نصوص اور شریعت کے عمومی مزاج و اندازِ تفکیر کے عین مطابق ہو۔ اس لیے ہر دور میں علماء نے بھرپور طریقے

* لیکچرر، شعبہ علومِ اسلامیہ، گورنمنٹ میونسپل گریجویٹ کالج، فیصل آباد

اور جہدِ پیہم سے فنِ تفسیرِ قرآن کو اپنایا۔ بر صغیر میں اس سلسلہ کو جاری کرنے والوں نے یہاں کی زبانوں میں تفسیر کی اور اہلِ عرب نے اپنے علاقائی اسالیب و مزاج کے مطابق۔ یہاں تک کہ دیگر یورپی زبانوں میں بھی اس فن کو خاصا اعتناء بخشا گیا۔ تاہم یہاں لکھی جانے والی تفاسیر میں مسلکی و فکری اور علاقائی مزاج کا غالب آنا ایک ایسا عنصر تھا جس نے بہت سی تفاسیر کو ان کے لکھنے والوں کے خاص حلقہ میں ہی محدود کر دیا۔ بہت کم ایسی تفاسیر میسر ہیں جن کو ان کی علمی و تحقیقی مزاج کے باعث قبولیتِ عامہ ملی ہو۔ ایسی کی ہی ایک تفسیرِ عصرِ حاضر کے امور استاذ و شیخ الحدیث مولانا عبد السلام بن محمد (بھٹوی) کے رشحاتِ قلم سے نکلی ہے، جس پر شاذ و نادر ہی کسی کا کلام ہو۔ تفسیر القرآن الکریم اپنے خصائص و امتیازات اور منہج و اسلوب میں تحقیقی مزاج کے باعث بہت کم عرصہ میں عوام و خواص میں مقبول ہوئی ہے۔

تفسیر کا تعارف:

تفسیر القرآن الکریم چار مجلدات پر مشتمل ہے۔ اس کی جلدِ اول میں عرضِ ناشر، عرضِ مترجم (جس میں مؤلف نے اپنے ترجمہ قرآن کے خصائص و ممیزات کو واضح کیا ہے اور عمومی اسلوبِ ترجمہ ذکر کیا ہے [1])، مقدمہ تفسیر اور سورۃ الفاتحہ تا سورہ التوبہ کی تفسیر شامل ہے۔ دوسری جلد سورہ یونس تا سورہ الحج تک کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد سورہ المومنون تا سورہ الزمر اور چوتھی جلد سورہ المومن تا سورہ الناس (آخرِ قرآن) کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ پہلی کے علاوہ باقی مجلدات مذکورہ سورتوں کی تفسیر سے شروع ہو جاتی ہیں۔

۴۔ مبحث چہارم: تفسیر القرآن الکریم کا منہج و اسلوب اور امتیازات۔

پیشِ نظر مضمون (تحریر) راقم کے مفصل تحقیقی مطالعہ کا دوسرا حصہ ہے۔ اول حصہ میں مولانا عبد السلام بن محمد کے ترجمہ قرآن کے خصائص و امتیازات کو تین مباحث میں زیر بحث لایا گیا تھا اور اس کی افادیت کو بیان کیا گیا تھا۔[2] جبکہ اس حصہ (دوم) میں چوتھی مبحث کے ذیل میں فاضل مفسر کی علمی کاوش 'تفسیر القرآن الکریم' کا مفصل منہج و اسلوب اور ان کے علمی طرزِ نگارش کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی تفسیر کے خصائص و منہج کو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ا۔ تفسیر القرآن بالقرآن کا عمدہ نمونہ:

موصوف نے کوشش کی ہے کہ ان کی تفسیر 'بالماثور' ہو اس لیے انہوں نے ابتدائی تین مراجع تفسیر القرآن ا۔ بالقرآن ۲۔ بالسنۃ ۳۔ باقوال الصحابہ پر ہی زور دیا ہے۔ اس حوالے سے وہ سب سے پہلے تفسیر قرآن کی روشنی میں ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ الفاظ کے معانی کی تعیین میں بھی قرآنِ مجید کو سامنے رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ قرآنِ مجید کی سب سے زیادہ صحیح تفسیر وہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ اس کے کلام کا معنیٰ و مراد کوئی نہیں جانتا اور وہ قرآنِ مجید اور حدیث رسول کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ قرآنِ مجید میں ایک مقام پر بات مختصر ہوتی ہے اور دوسری جگہ وہی بات مفصل اور واضح ہوتی ہے"[3]

قرآن کی تفسیر جب وہ بالقرآن کرتے ہیں تو اس کے مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے اختصار کے لیے ہر جگہ پوری آیات اوران کا ترجمہ نقل کرنے کی بجائے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے ہیں"[4]

تفسیر القرآن بالقرآن کی امثلہ درج ذیل ہیں:

۱۔ آیتِ کریمہ "وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یعنی اس کے بعد اور سخت عذاب ہے۔ اب اس کی مختلف صورتیں تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، جن میں سے بہت سی چیزیں قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، البتہ عذاب کے طور پر مسلط ہونے والی بھوک اور زقوم کے کھانے کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے، فرمایا: (اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَاۗءِ الْجَحِيْمِ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ)[الدخان:۴۳تا۴۹] "بیشک زقوم کا درخت۔ گناہ گار کا کھانا ہے۔ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح، پیٹوں میں کھولتا ہے۔ گرم پانی کے کھولنے کی طرح۔ اسے پکڑو، پھر اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک دھکیل کر لے جاؤ۔ پھر کھولتے پانی کا کچھ عذاب اس کے سر پر انڈیلو۔ چکھ، بیشک تو ہی وہ شخص ہے جو بڑا زبردست، بہت باعزت ہے۔"[5]

۲۔ اس کی دوسری مثال آیتِ کریمہ 'اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ' ہے جس کی تفسیر بالقرآن یوں کرتے ہیں:

" دل بیمار ہو تو اچھے برے کا شعور بھی ختم ہو جاتا ہے، پھر آدمی اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، فرمایا: اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا[فاطر:۸] "تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اس کو اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟)"[6]

۲۔ تفسیر القرآن بالحدیث:

تفسیر القرآن الکریم میں اکثر آیات کے ذیل میں احادیث ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ موصوف کے پیشِ نظر قرآن کی تفسیر 'بالماثور' تھی۔ اس پر کلام کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ ذیل میں تفسیر القرآن بالحدیث کی امثلہ درج ہیں:

۱۔ آیتِ کریمہ "لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ "کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیونکہ کسی کے بھی احسان کی قدردانی اور اس کا شکریہ ادا کرنے سے اس کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کا کہنا ہی کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'ولا شخص أحب إليه المدحة من الله، من أجل ذلك وعد الله الجنة ' کوئی شخص ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنی تعریف پسند ہو اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے"[7]

۳۔ تفسیر میں احادیث و روایات کی صحت و ضعف کا بیان:

اس بات کی تفصیلی تذکرہ سطورِ بالا میں کیا جاچکا ہے کہ مولانا موصوف نے قرآن کی تفسیر جو منہج اختیار کیا ہے اس کا تذکرہ مقدمہ تفسیر میں کیا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے اولاً قرآن کی تفسیر قرآن سے، اس کے بعد حدیث سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ وہ خود اس بات کے قائل ہیں کہ ان کی تفسیر بالماثور کا ایک عملی نمونہ ہے۔ اس بارے وہ لکھتے ہیں:

"احادیثِ رسول سے متعلق میں نے پوری کوشش کی ہے کہ صرف ثابت شدہ احادیث نقل کروں'[8]

اس لحاظ سے مفسر نے عرق ریزی سے صحیح احادیث کو تفسیر کا حصہ بنایا ہے۔ بلکہ ان کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صحت و ضعف کا حکم اور کیفیت بھی نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"کسی بھی مفسر کی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صرف وہ روایت نقل کرے جو صحیح یا حسن سند کے ساتھ ثابت ہو، اگر کوئی دوسری روایت بیان کرے تو اس کا باطل ہونا بھی بیان کرے"[9]

چنانچہ جب کسی حدیث کو نقل کرتے ہیں اور وہ صحیحین کے ماسوا ہو تو اس کی صحت و ضعف کے بارے کوئی نا کوئی صراحت ضرور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا' کے ذیل میں روایات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسند أحمد : ۲، ۲۱۸، ح : ۷۰۵۴۔ مسند أبي يعلٰى : ۶، ۴۲۵، ح : ۷۳۳۹ [مسند احمد اور مسند ابی یعلٰی] دونوں کی تحقیق میں اسے حسن کہا گیا ہے ۔"[10]

اسی طرح ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

"دکتور حکمت بن بشیر نے اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ کا قول ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ سعید بن جبیر کے واسطے سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسی سند کے ساتھ روایت کرکے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے اور ابن مسعود (رض)کا قول طبری اور بیہقی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے اسے صحیح کہا ہے۔ [السنن الكبرىٰ للبيهقي : ۳، ۳۶۳]"

تفاسیر میں بیان کی جانے والی ضعیف روایات کا عام طور پر تذکرہ کرتے ہیں اور ان کا ضعف بھی واضح کرتے ہوئے تنبیہ کرتے ہیں کہ یہ روایات مذکورہ آیت کی تفسیر نہیں بن سکتی۔ مثال کے طور پر 'اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ' کی تفسیر میں فائدے کے طور پر ضعیف روایات نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"اس مقام پر کتب تفسیر میں چند احادیث مروی ہیں جو سنداً ثابت نہیں ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں سے وہ روایات اس کے محقق دکتور حکمت بن بشیر کی تحقیق کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔'

یہ روایت لیث بن ابی سلیم راوی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے۔"

آخر میں لکھتے ہیں:

" اس کی سند میں دو راوی جویبر اور حسین) بن داؤد (ضعیف ہیں اور ابن مسعود) رض (سے روایت کرنے والے راوی ضحاک کی ان سے ملاقات ثابت نہیں۔ حافظ ابن کثیر) رض (نے ان تمام روایات کے متعلق فرمایا" : زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف) صحابہ کے اقوال (ہیں) مگر صحابہ سے بھی اکثر اقوال کی سند کمزور ہے (۔ " یہ روایات جن میں برائی سے نہ روکنے والی نماز کو کالعدم اور اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث بیان کیا گیا ہے، ان کی حقیقت میں نے اس لیے بیان کر دی ہے کہ ایسا فتویٰ لگانے والا شخص فتویٰ کی سنگینی پر غور کرے اور اس بات پر بھی کہ وہ نبی) ﷺ (کے ذمے ایسی بات لگا رہا ہے جو آپ) ﷺ (سے ثابت نہیں)"۔[11]

اسی طرح اگر روایت کے الفاظ میں کسی قسم کا تفاوت ہو تو رواتِ حدیث سے ان کی تعیین و توثیق ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'والذين هم على صلاتهم يحافظون' کی تفسیر میں درج ایک حدیث کے بارے لکھتے ہیں:

"حاکم نے فرمایا، یہ لفظ دو ثقہ راویوں بندار بن بشار اور حسن بن مکرم کی روایت سے ثابت ہیں، جو ان دونوں نے عثمان بن عمرو سے روایت کی ہے اور یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، جب کہ شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ "[12]

۴۔ دورانِ تفسیر بیان کردہ احادیث میں ظاہری تعارض کا حل:

تفسیر کرتے ہوئے جن احادیث کو مفسر نقل کرتے ہیں اگر ان سے متعلقہ کسی ضمنی بحث یعنی معنوی طور پر ظاہری تعارض محسوس ہو رہا ہو تو اس کا حل پیش کرتے ہوئے درست رائے اور مسئلہ ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ ' وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ' کی تفسیر میں لکھی گئی روایات کا ظاہری تعارض حل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاد کبیر کی تفسیر دعوت و قتال دونوں کے ساتھ کرنا اس لیے بھی راجح ہے کہ رسول اللہ) ﷺ سے پوچھا گیا :أَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ ؟کون سا جہاد افضل ہے ؟آپ ﷺ نے فرمایا : مَنْ وَ أُهْرِيْقَ دَمُهُ عُقِرَ جَوَادُهُ[ابن ماجه، الجهاد، باب القتال في سبيل الله : ٢٧٩٤، قال الشيخ الألباني صحيح]۔۔۔ ایک آدمی نے اس وقت رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا جب آپ رکاب میں پاؤں رکھ چکے تھے : أَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ ؟ کون سا جہاد افضل ہے ؟ " آپ ﷺ نے فرمایا : كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ کسی ظالم بادشاہ کے پاس حق بات کہہ دینا۔[نسائي، البيعة، باب فضل من تكلم بالحق عند إمام جائر : ۴۲۱۴] " ظاہر ہے ظالم بادشاہ کے سامنے وہی شخص کلمۂ حق کہہ سکتا ہے جو اس کے سامنے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جائے گا، یہ ہر ایرے غیرے کا کام نہیں۔ اس لیے پچھلی حدیث میں اور اس میں کوئی تضاد نہیں"[13]

۵۔ تفسیر القرآن باقوال الصحابہ؛ صحابہ کے اقوال کی علمی و تفسیری حیثیت اور تفسیر میں ان کا تذکرہ:

موصوف (مولانا عبد السلام بن محمد) نے تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال سے نہایت ہی محتاط انداز میں اخذ و استفادہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک صحابہ کرام کا مرتبہ تفسیرِ قرآن کی غرض سے مسلّم اور بعض مقامات پر ضروری ہے۔ چنانچہ صحابہ کے اقوال کی علمی و تفسیرِ قرآن میں اصولی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کے بعد صحابہ کرامؓ سے منقول تفسیر کا مقام ہے، کیونکہ وہ صاحبِ زبان تھے اور انہوں نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ قرآن مجید سنا اور سمجھا تھا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان کی تفسیر صحیح سند سے ثابت ہو اور اسرائیلیات سے نہ ہو۔ صحابہ جب کسی تفسیر پر متفق ہوں تو ان سے اختلاف جائز نہیں"[14]

اس اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ قرآن کی تفسیر میں اقوالِ صحابہ کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کی روشنی میں تفسیر کرتے ہیں۔ اس کی امثلہ ان کی تفسیر میں جابجا بکھری ہیں تاہم چند ایک یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

ا۔ آیتِ کریمہ "وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"''ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنھما نے فرمایا: مَا مِنْ عَامٍ أَمْطَرَ مِنْ عَامٍ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَصْرِفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ ثُمَّ قَرَأَ) : وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا (مستدرک حاکم : ٤٠٣/٢، ح : ٣٥٢٠- طبري : ٢١٢١٦- سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٤٦٠/٥، ح : ٢٤٦١ -----------ابن عباسؓ کا قول ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ سعید بن جبیر کے واسطے سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسی سند کے ساتھ روایت کرکے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے اور ابن مسعودؓ کا قول طبری اور بیہقی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے اور امام بیہقی نے اسے صحیح کہا ہے۔ [السنن الکبریٰ للبیہقي : ۳، ۳۶۳]''"[15]

اس کے بعد دونوں صحابہ کرام کے اقوال کی روشنی میں فیصلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان دو جلیل القدر صحابہ کے قول کی رو سے یہ تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ بات وہ اپنے پاس سے نہیں کہہ سکتے، اس لیے یہ حکماً مرفوع ہے۔"[16]

صحابہ کے اقوال کی اس (مذکورہ بالا) حیثیت کے پیشِ نظر مفسر نے اکثر مقامات پر تفسیرِ لغوی یا تفسیر بالرائے کو اختیار نہیں کیا بلکہ ان کے اگر کسی زیرِ بحث مسئلہ میں کسی صحابی کا قول آ گیا جس کے کوئی مخالف نہ پایا تو اسی پر تفسیر کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔

٦۔ علمی نکات کا بیان یا فائدے کے طور پر مفسرین کی کلام کو نقل کرنا:

بسا اوقات مفسر کسی آیت کی تفسیر میں اپنی کلام کی بجائے کسی بڑے عالم یا مفسر کی کلام کو نقل کر دیتے ہیں اور وہاں علمی دیانت کے طور پر اس بات کا تذکرہ بھی کر دیتے ہیں کہ اس کلام کو نقل کرنے کا مقصد کیا ہے اور یہ ساری کلام کس مفسر یا عالم کی ہے۔ ایسا ان کی تفسیر میں شاذ و نادر یعنی بمشکل تین یا چار مقامات پر ہوا ہے۔ وگرنہ وہ تفسیر میں ذاتی کلام کرتے ہیں اور اس میں استفادہ کم و بیش ۳۰ سے ۳۵ تفاسیر سے کرتے ہیں۔ اس بارے ان کا اصول یہ ہے:

"اس کے بعد مفسرین کرام کی تفاسیر قرآن فہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ بشرطیکہ ان میں قرآن و سنت سے گریز اختیار نا کیا گیا ہو اور وہ لغت عرب کے مطابق ہوں"[17]

مفسرین کی کلام میں مثال کے طور پر لقمانِ حکیم کی بابت تصریح میں مختلف علماء کے بے سروپا اقوال کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے بھی یہ سارا کلام یہ دکھانے کے لیے نقل کیا ہے کہ بعض مفسرین کس طرح بلاثبوت باتیں نقل کرتے جاتے ہیں اور یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کرتے کہ مجاہد، قتادہ، ابن المسیّب وغیرہ حضرات کا ہزاروں برس پہلے گزرے ہوئے لقمان کے ساتھ کوئی میل جول رہا ہے، یا انھوں نے ان تک کوئی سند بیان کی ہے۔ نہ رسول اللہ) ﷺ (کی طرف منسوب روایت نقل کرتے ہوئے یہ اہتمام کرتے ہیں کہ ثابت شدہ روایت ہی نقل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا اور جسے صاحب روح المعانی نے ترجیح دی ہے۔ ان کے غلام یا حبشی وغیرہ ہونے کی کوئی روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ البتہ نبی) ﷺ (کی بعثت سے پہلے بھی ان کی حکمت اور دانائی کے واقعات عرب میں مشہور تھے اور جاہلی شعراء اور خطباء اپنے کلام میں ان کا ذکر کرتے تھے، جیسا کہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے۔"[18]

الغرض، تفسیر میں اگر کسی جگہ کسی عالم یا مفسر کی بات نقل کی ہوتی ہے تو اس کا مکمل ذمہ داری اور دیانت کے اصولوں کے پیشِ نظر حوالہ بھی درج کرتے ہیں اور اس کو نقل کرنے کا مقصد بھی بیان کرتے ہیں جو کسی فائدے سے خالی نہیں ہوتا۔

۷۔ اسرائیلیات کے بارے مفسر کی رائے اور اسرائیلیات کا ذکر:

تفسیر القرآن الکریم میں مؤلف نے اسرائیلیات کے ذکر اور ان سے اخذ و استفادہ میں از حد احتیاط برتی ہے اور خواہ مخواہ کسی آیت کی تفسیریں دیگر مراجع کی وجودگی میں ان سے استدلال نہیں کیا۔ اس حوالے سے انہوں نے مقدمہ تفسیر میں اسرائیلیات سے اخذ و استدلال کے بارے بہت ہی غزیر الفائدہ گفتگو کی ہے (جو یقیناً شائقینِ علم کے مراجعت و مطالعہ کے قابل ہے) اور ان کی علمی و استدلالی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ ان کی تینوں اقسام کے بارے جائز صورت پر کلام کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں جن کے درست ہونے کا یقین ہو، کیونکہ جس بات کے غلط ہونے کا گمان بھی ہو اسے بیان کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے"[19]

اس طرح خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

"تیسری قسم کی اسرائیلی روایات کو عام گفتگو میں ذکر کرنا جائز بھی ہو تو ان کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے قرآنِ مجید کی تفسیر میں انہیں ذکر کرنا ہرگز جائز نہیں"[20]

الغرض اسرائیلیات میں سے جو قابلِ ذکر و استدلال قسم ہے ان کا ذکر کیا ہے، اگرچہ ان کی صراحت کی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں اور اسرائیلی روایت ہے۔ اس حوالے سے آیتِ کریمہ 'اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ' کی تفسیر میں ذکر کی جانے والی روایت جس میں حضرت موسیٰؑ اور ان لڑکیوں کے چلنے کا قصہ موجود ہے، کا حکم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا، عمر اور ابن عباس) رض (کا قول ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔] ابن أبي حاتم : ۱۶۸۴۳ [دوسرے ائمہ کے اقوال بھی طبری) ۲۷۶۰۹ (یا ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیے ہیں، مگر یہ رسول اللہ) ﷺ (سے مروی نہیں، اس لیے اس کا ماخذ اسرائیلی روایات ہی ہے۔"[21]

اسرائیلیات سے منقول بعض تفسیری اقوال کو لایعنی قرار دے کر ان کا رد کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'درخت جس کا پھل آدم و حوا علیہما الصلاۃ والتسلیم نے کھایا' اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "یہ کون سا درخت تھا؟ اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایا۔ نہ ہی نبی کریم ﷺ نے بتایا۔ اگر ضرورت ہوتی یا اس سے کوئی فائدہ ہوتا تو ضرور بتا دیا جاتا۔ بعض مفسرین نے گندم یا انگور یا انجیر وغیرہ کا نام لیا ہے، مگر یہ سب اقوال بلا دلیل ہیں"[22]

۸۔ لفظ کی کسی دوسری آیت کریمہ سے وضاحت:

کسی بھی لفظ کا ترجمہ کرنے سے قبل مفسر قرآن کی دیگر آیات کو استشہاد کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ الفاظ کے معانی قرآن سے ہی ثابت ہو جائیں اور کسی دوسرے مرجع کی ضرورت پیش نا آئے۔ اس حوالے سے اکثر مقامات پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے (اگر تفسیر کے محض تین اوراق ہی پڑھے جائیں تو اس کی کم و بیش پانچ امثلہ ضرور سامنے آئیں گی)۔ اس کی مثال آیت کریمہ ' وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ' میں لفظ دابّہ ہے جس کی وضاحت درج ذیل ہے:

> "دَابَّةٍ' دَبَّ يَدِبُّ دَبِيْبًا "سے اسم فاعل ہے، جس کا معنی آہستہ چلنا ہے۔ ہر جان دار خواہ مذکر ہو یا مؤنث، عاقل ہو یا غیر عاقل، سب پر "دَابَّةٍ "کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: (وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّنْ مَّاءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي بَطْنِه وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓي اَرْبَعٍ)[النور:۴۵] "اور اللہ نے ہر چلنے والا (جان دار) ایک قسم کے پانی سے پیدا کیا، پھر ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو چار پر چلتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے پیٹ پر یا دو یا چار ٹانگوں پر چلنے والے تمام جانداروں کو "دَابَّةٍ "فرمایا۔[23]

۹۔ ائمہ و کتبِ لغت سے استشہاد:

لغوی مسائل کے حل میں نصوص کے بعد سب سے پہلے کتبِ لغت اور آئمہ لغت کی تصریحات کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی مضبوط لغوی کی کلام یا تصریح اس حوالے سے دستیاب ہو تو اسے نقل کیا جائے۔ اس حوالے سے لفظِ 'الدوابّ' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان کو "الدَّوَابِّ "میں اس لیے شمار کیا کہ کتب لغہ میں ہر جاندار کو دابہ کہہ لیتے ہیں۔ مصباح میں ہے " دَابَّۃ "زمین کا ہر جاندار، خواہ سمجھ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، یعنی کفار و منافقین جو کان سے اچھی بات نہ سنیں، زبان سے اچھی بات نہ نکالیں اور اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام نہ لیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام جانوروں سے بدتر ہیں، کیونکہ جانور تو اپنے فطری تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور ان لوگوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مگر یہ اس غرض کو بھی پورا نہیں کرتے۔"[24]

اس کی دوسری مثال جس میں معتبر کتبِ لغت اور آئمہ کی تصریحات نقل کی ہیں، لفظِ مصانع کی تفسیر ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

"مَصْنَعٌ" یا "مَصْنَعَۃٌ" کی جمع ہے۔ مختار الصحاح اور قاموس میں اس کا معنی بڑے بڑے قلعے، مضبوط محلات اور زمین دوز نہریں لکھا ہے۔ راغب لکھتے ہیں کہ " صَنْعٌ "کا معنی کوئی کام عمدہ طریقے سے کرنا ہے۔ عالی شان جگہوں کو " مَصَانِعَ " کہا گیا ہے۔"[25]

۱۰۔ الفاظ کی توضیح میں ائمہ لغت وراسخ العلم علماء کی تصریحات کا ذکر:

مولانا عبد السلام بن محمد تفسیرِ قرآن میں ان مقامات پر جو بین المسالک یا بین المذاہب مختلف فیہ امور و مسائل سے متعلق ہوتے ہیں، راسخ العلم علماء کے اقوال سے الفاظ کے معانی کی تعیین کرتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ دیگر نصوص و دلائل کی بنیاد پر تفسیر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'تُوُفِّیَ' کے معنی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (رض) نے "اَلْجَوَاب الصَّحِیْحُ "میں لکھا ہے کہ لغت عرب میں "تَوَفِّیْ "کے معنی " اِسْتِیْفَاءٌ "اور قبض کے آئے ہیں اور یہ نیند کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور موت کی صورت میں بھی اور یہ " تَوَفِّی الرُّوْحِ مَعَ الْبَدَنِ جَمِیْعًا "(روح اور بدن دونوں کو لے لینے) کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت میں (مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ) سے عیسیٰ (علیہ السلام) کا مع جسم آسمان کی طرف اٹھایا جانا مراد ہے۔ جیسا کہ فرمایا: (وَرَافِعُكَ اِلَیَّ) "اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ "دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے قتل اور سولی کی نفی فرمائی اور "تَوَفِّیْ "کا لفظ استعمال کیے بغیر فرمایا: (بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ) [النساء:۱۵۸] "بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔"[26]

۱۱۔ لفظ سے پیدا ہونے والے معنوی اشکال کا جواب:

کلام اللہ کی حیثیت بالکل واضح اور غیر مبہم ہے تاہم اگر کسی جگہ پر اس میں ہماری دانست میں کوئی شک یا احتمالی معنیٰ یا کسی قسم کا اشکال واعتراض سامنے آئے تو اس کی وضاحت کبار علماء کی صراحتوں سے ہو جاتی ہے۔ اصلاً کتاب اللہ کسی قسم کے اشکال و شبہ سے خالی ہے۔ لیکن اگر کسی آیت یا لفظ پر ذہن میں خلش ہو تو اس کا حل علماء کی تصریحات میں مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ فوق کلّ ذی علم علیم کا بھی یہی تقاضا ہے۔ الغرض مفسر (عبد السلام بن محمد) نے ایسے مقامات پر بہت ہی عمدہ تصریحات پیش کی ہیں اور اعتراضات کو حل کرتے ہوئے ذہن میں پیدا ہونے والے ممکنہ اشکالات کو رفع کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کی امثلہ درج ذیل ہیں:

۱۔ آیتِ کریمہ ' وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' ہے جس کے بارے کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "ظَلاَّمٌ "مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا معنی بہت ظلم کرنے والا ہے۔ بظاہر معنی یہ ہوا کہ "اللہ بندوں پر بہت ظلم کرنے والا نہیں "گویا کم ظلم کر سکتا ہے۔ اس کا ایک جواب استاد مرحوم مولانا محمد عبدہ (رض) نے دیا ہے: "اس مبالغے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعوذ باللہ رتی برابر بھی ظلم صادر ہو تو وہ "ظَلاَّمٌ "ٹھہرے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم سے منزہ ہے۔" یہ جواب بھی اچھا ہے، مگر اس سے قوی جواب یہ ہے کہ بعض اوقات مبالغے کے صیغے پر نفی آئے تو اس سے مراد مبالغہ کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ نفی میں مبالغہ ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ "اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔"

جیسا کہ طرفہ نے کہا ہے:

وَلَسْتُ بِحَلَّالِ التِّلَاعِ مَخَافَةً

وَلٰكِنْ مَتٰى يَسْتَرْفِدِ الْقَوْمُ أَرْفِدِ

ظاہر الفاظ کے مطابق ترجمہ یہ ہو گا "اور میں خوف کی وجہ سے ٹیلوں پر بہت زیادہ چڑھنے والا نہیں، بلکہ قوم جب مجھ سے عطیہ مانگے تو میں عطیہ دیتا ہوں۔"
مگر یہاں یہ معنی نہیں کہ میں بہت زیادہ چڑھنے والا نہیں، بلکہ معنی ہے کہ میں بالکل ٹیلوں پر نہیں چڑھتا۔ دلیل یہ ہے کہ میں عطیہ مانگنے پر دیتا ہوں۔[27]

۲۔ اسی طرح اس کی دوسری مثال آیتِ کریمہ 'وَقَاسَمَهُمَآ' ہے جس پر وارد ہونے والے اشکال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باب مفاعلہ (مقاسمہ) دو طرف سے مقابلہ کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں صرف شیطان نے قسم کھائی تھی، آدم (علیہ السلام) نے مقابلے میں کوئی قسم نہیں کھائی، اس لیے یہاں مبالغہ کے لیے ہے، لہٰذا ترجمہ "بار بار قسم کھائی "کیا گیا ہے۔"[28]

۱۲۔ الفاظ کے معنیٰ کو بیان کرنے میں اشعار سے استشہاد:

اکثر اوقات تو دورانِ تفسیر کسی لفظ کا معنٰی واضح کرنے کے لیے اشعارِ عرب سے استشہاد پیش کرتے ہیں اور اپنے کیے ہوئے ترجمہ اور معنٰی کی تائید کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تفسیر میں جابجا عربی، فارسی اور اردو اشعار ملتے ہیں جو اس غرض کے علاوہ دیگر اغراض کے لیے بھی لاتے ہیں جن کا تذکرہ اگلے مقام پر آرہاہے۔ اشعار سے استشہاد کی مثال درج ذیل ہے:

ا۔ آیتِ کریمہ "وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا" کے الفاظ کی لغوی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اَثَاثًا" گھر کا سازوسامان جو بہت ہو۔ "اَثَّ يَؤُثُّ "(ن) جب کوئی چیز بہت اور گھنی ہو۔ امرءالقیس نے بالوں کی چوٹی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ۔

وَ فَرْعٍ يَزِيْنُ الْمَتْنَ أَسْوَدَ فَاحِمٍ

أَثِيْثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ

"أَثِيْثٍ "یعنی گھنے، "مَتَاعًا "گھر کی ضرورت کی خاص چیزیں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ "اَثَاثًا "میں "مَتَاعًا" بھی داخل ہے، مگر اس کی اہمیت کی بنا پر الگ بھی ذکر فرمایا۔"[29]

۱۳۔ تذکیر نفس میں علماء کے اشعار کا ذکر:

دورانِ تفسیر وعظ و نصیحت کے لیے آیاتِ تذکیر کے تحت علماء کے اشعار کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ او بڑے ہی ناصحانہ انداز میں تفسیر کرتے ہیں۔ اکثر موت و حیات، زندگی کی حقیقت اور انسان کے فانی ہونے سے متعلقہ مقامات پر اس قسم کی تفسیر اور اشعار ذکر کرتے ہیں۔ اس کی امثلہ درج ذیل ہیں؛

ا۔ آیتِ کریمہ 'وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ابن کثیرؒ نے امام احمدؒ کے متعلق نقل فرمایا کہ وہ یہ دو اشعار پڑھا کرتے تھے، جو یا تو ان کے ہیں یا کسی اور کے ۔

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلاَ تَقُلْ

خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيْبُ

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً

وَ لَا أَنَّ مَا يَخْفٰى عَلَيْهِ يَغِيْبُ

"یعنی جب تو کسی بھی وقت اکیلا ہو تو یہ نہ کہنا کہ میں اکیلا ہوں، بلکہ کہنا کہ مجھ پر ایک زبردست نگران ہے اور نہ کبھی گمان کرنا کہ اللہ تعالیٰ ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہے اور نہ یہ کہ کوئی پوشیدہ چیز اس کے علم سے باہر ہے۔ "[30]

۲۔ آیتِ کریمہ 'كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"چنانچہ ابن کثیر (رض) نے یہاں دو شعر نقل فرمائے ہیں جو امام شافعی (رض) نے ایسے ہی کسی موقع پر پڑھے ۔

تَمَنّٰى رِجَالٌ أَنْ أَمُوْتَ وَ إِنْ أَمُتْ

فَتِلْکَ سَبِیْلٌ لَسْتُ فِیْهَا بِأَوْحدِ

فَقُلْ لِلَّذِيْ یَبْغِيْ خلاَفَ الَّذِيْ مَضٰی

تَهَیَّأْ لِأُخْرٰی مِثْلِهَا فَکَأَنْ قَدِ

"کچھ لوگوں نے میری موت کی تمنا کی ہے اور اگر میں مر جاؤں تو یہ ایسا راستہ ہے جس میں میں اکیلا نہیں ہوں۔ سو اس شخص سے کہہ دو جو جانے والے کے بعد اس کی جگہ کا طلب گار ہے کہ تو بھی اس جیسی ایک اور (موت) کے لیے تیار ہو جا اور سمجھ لے کہ وہ بس آ ہی چکی۔"

ایک فارسی شاعر نے خوب کہا ہے

بے فنائے خود میسر نیست دیدار شما

مے فروشد خویش را اول خریدار شما

"اپنے فنا ہونے کے بغیر تمہارا دیدار میسر نہیں ہو سکتا، اس لیے تمہارا خریدار پہلے اپنے آپ کو فروخت کرتا ہے۔"[31]

۱۴۔ اشعار سے استشہاد اور باطل نظریات کی تردید:

موصوف فارسی، عربی اور اردو کی اشعار ذکر کر کے ان سے کشید یا ان مین بیان کیے گئے باطل نظریات کا رد بھی کرتے ہیں۔ اور ان کی بنیاد پر گمراہ کن نظریات کی تردید اور ان کی "علمی حیثیت" بھی واضح کرتے ہیں۔ اس حوالے سے تفسیر کے مقدمہ میں انہوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ یہ اکثر اوقات باطنی فرقوں کی کارستانی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ غلط نظریات کو عوام میں رائج کر دیتے ہیں اور ان سے اپنے من چاہے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"باطنی فرقوں کے پیروکار لوگوں نے تصوف کے پردے میں وحدۃ الوجود کے نام پر خالق و مخلوق کو ایک قرار دے کر اصولِ حدیث ایک طرف، مکمل قرآن و حدیث ایک طرف اور اسلام ہی کو بے معنٰی قرار دینے کی کوشش کا نام تفسیرِ قرآن رکھا ہے، جو دراصل تحریفِ قرآن ہے"[32]

صوفیا کہ گروہوں کا رد کرتے ہیں جنہوں نے قرآنی آیات کو اپنے عقائدِ باطلہ کے ثبوت و ترویج کے لیے استعمال کیا ہے۔ ایسی آیات کے تحت ان کے نظریات کی خوب قلعی کھولتے ہیں۔ اس قسم کی امثلہ درج ذیل ہیں:

ا۔ اسی طرح آیتِ کریمہ "وَمَا کَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَاءً وَّتَصْدِیَةً" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وہ لوگ کعبہ کے پاس عین حرم میں تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے اور اسے اپنی نماز، اللہ کی عبادت اور اس کے قرب کا ذریعہ قرار دیتے۔ افسوس کہ اب مسلمانوں نے بھی نمازیں اور قرآن چھوڑ کر عاشقانہ اشعار، سیٹیوں اور تالیوں کے مجموعے قوالی کو طریقت و معرفت کا نام دے کر روح کی غذا قرار دے رکھا ہے۔ بیشمار لوگ اسے تصوف کا اہم رکن قرار دے کر صرف سیٹیوں اور تالیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باقاعدہ مرشد کے ارد گرد طواف اور رقص کر کے اسے اپنی نماز سمجھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں۔

نماز عابداں سجدہ سجود است

نماز عاشقاں کلی وجود است

"عابدوں کی نماز سجدہ سجود ہے مگر عاشقوں کی نماز (معشوق کا) پورا وجود ہی ہے۔ "

ایک صوفی نے تو صاف ہی اپنے مرشد کو قبلہ بھی قرار دے دیا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے ۔

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

"ہر قوم کا ایک راستہ، ایک دین اور ایک قبلہ ہوتا ہے، مگر میں نے تو اپنا قبلہ ایک ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف سیدھا کر لیا ہے۔"

اگر ان میں سے کوئی نماز پڑھتا بھی ہے تو ایسے طریقے سے جس طریقے سے پڑھنے والے کو رسول اللہ (صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) نے فرمایا تھا کہ دوبارہ نماز پڑھ، تو نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ اللہ کی قسم! جب تک مسلمان تصور شیخ کا شرک اور صوفیوں کی عبادت کے یہ خود ساختہ طریقے اور موسیقی و رقص جیسی دل میں نفاق پیدا کرنے والی خرافات ترک نہیں کرتے اور رسول اللہ (صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ارکان اسلام و ایمان کی پابندی، خصوصاً جہاد نہیں کرتے کبھی دنیا میں سر نہیں اٹھا سکتے، ہمیشہ ذلت و خواری ہی ان پر مسلط رہے گی۔[33]

مسلمانوں میں الحمد للہ توحید الٰہی پر قائم لوگ کثرت سے موجود ہیں، مگر کئی ایسے گمراہ بھی ہیں جنھوں نے صاف کہہ دیا:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر

اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

یہ بعینہ اوپر مذکور شرکیہ عقیدہ ہے، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو توحید الٰہی کا عقیدہ رکھنے کی ہدایت اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔[34]

۲۔ اس کی دوسری مثال "قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ" کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرکین عرب کا عقیدہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ جسے پکڑ لے اسے کوئی پناہ دے کر چھڑا نہیں سکتا اور جسے اپنی پناہ میں لے لے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مگر افسوس کہ بعض مسلمان کہلانے والے شرک میں اس حد تک بڑھ گئے کہ مخلوق کو خالق سے بھی زیادہ اختیار رکھنے والا بنا دیا، چنانچہ ایسے ہی ایک تک باندھنے والے نے کہا ہے ۔

خدا جس کو پکڑے چھڑا لے محمد

محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

اس کے بعد بہت ہی عمدہ تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عجیب بات یہ ہے کہ اس صریح شرک اور اللہ تعالیٰ کی شدید گستاخی کے باوجود انھیں اصرار ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے مسلمان ہیں۔ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: (لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللهِ وَ رَسُوْلُهُ) [بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول اللہ تعالیٰ: (واذكر في الكتاب مريم۔۔): ۳۴۴۵] "مجھے حد سے مت بڑھاؤ، جیسے نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، چنانچہ یہی کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔"[35]

۱۵۔ فقہی مسائل میں علماء کی آراء کا اہتمام:

تفسیر القرآن الکریم کے بارے مفسر کی ذاتی رائے یہ ہے کہ اس میں آیاتِ احکام و مسائل کی تفسیر پر خاصا زور دیا گیا ہے اور ان کی تفسیر اصلاً بالماثور ہی کی گئی ہے۔ بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ثانوی مآخذ کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ مفسر نے احکام سے متعلقہ آیات کی تفسیر میں بہت زیادہ محنت اور جانفشانی سے تفسیر کی ہے اور علماء کی تصریحات کی روشنی میں مسائل کا غیر جانبدارانہ حل پیش کیا ہے۔ اس لیے دورانِ تفسیر فقہاء اور مشاہیر ائمہ کے اقوال کو خاص جگہ عنایت کرتے ہیں اور مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"امام مالک، امام شافعی (رح) اور جمہور کا یہی قول ہے، البتہ امام ابو حنیفہ (رض) کا قول یہ ہے کہ تمتع اور قرآن صرف باہر سے آنے والوں کے لیے ہے، اہل مکہ کے لیے جائز نہیں۔ (ابن عاشور) مسجد حرام کے رہنے والوں سے مراد مکہ میں رہنے والے اور مکہ سے اتنی مسافت کے اندر رہنے والے ہیں جس پر قصر ہوتا ہے (جو تقریباً اکیس کلو میٹر ہے)۔ بعض نے اس سے صرف حرم مکہ کے اندر رہنے والے مراد لیے ہیں۔"[36]

بعض جگہوں پر تابعین کے اقوال تحریر کرتے ہیں اور ان میں جمع کی کوشش کرتے ہیں تاکہ تفسیر کے لیے ان کے بعد کسی اور مرجع کی طرف نا جایا جائے۔ تابعین کے اقوال کی علمی و تفسیری حیثیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"تابعین کے اقوال بھی قرآنِ مجید سمجھنے کے لیے بہت مفید ہیں، بشرطیکہ صحیح سند کے ساتھ ان سے ثابت ہوں اور اسرائیلیات میں سے نہ ہوں۔"[37]

تابعین کے اقوال کی صحت و ضعف کا بھی خاص اہتمام کرتے ہیں اور دکتور حکمت بن بشیر کی تفسیر ابن کثیر پر چھپی ہوئی تعلیق سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں۔ تابعین کے اقوال کے حوالے سے مثال 'قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ' ہے جس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ دستر خوان اترا یا نہیں، اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ اترا، شوکانی، ابن جریر اور بہت سے علماء نے اسی کو صحیح کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تاکید کے ساتھ فرمانا: (اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ) "یقیناً میں اسے تم پر اتارنے والا ہوں۔" یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اتارا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ قول مجاہد اور

حسن بصری کا ہے، ان کی سندوں کو ابن کثیر نے صحیح کہا ہے، مگر یہ بھی تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کا قول ہے، رسول اللہ (ﷺ) سے یہ بات بھی ثابت نہیں۔"[38]

۱۶۔ اختلافی مسائل پر غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار اور دلائل کی پیروی:

مفسر نے جن جن مقامات پر کسی مسئلہ پر مفصل کلام کی ہے ان میں سے ایک 'مسئلہ حجاب' ہے۔ آیاتِ حجاب کے ضمن میں انہوں نے فریقین کے تمام بنیادی مراجع و مصادر کی روشنی میں دلائل کا تجزیہ اور محاکمہ کیا ہے۔ جس کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اختلافی مسائل پر وہ انتہائی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح دلائل کی روشنی میں اپنی رائے کو بیان کرتے ہیں۔ اگر فریقین میں کسی نکتہ کی تفہیم یا جزئی کے محمل کا اختلاف ہو تو اس کو بھی واضح کرتے ہیں۔ چنانچہ " اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا " میں ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ کے آثار کی توجیہ (جن کی وجہ سے چہرے کے پردے وعدم پر کلام ہے) یوں بیان کرتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ابن مسعود اور ابن عباسؓ کے موقف میں کوئی اختلاف نہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی تفسیر اجنبیوں کے اعتبار سے فرمائی ہے اور ابن عباسؓ نے "اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا " کی تفسیر اپنے لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہے۔ ابن مسعودؓ کا مطلب یہ ہے کہ اجنبیوں کے سامنے ظاہری کپڑوں کے سوا کوئی زینت ظاہر نہ کریں اور ابن عباسؓ کا مطلب یہ ہے کہ " زینت (ظاہر، چہرہ اور ہاتھ) خاوند کے علاوہ اپنے محرموں کے سامنے بھی ظاہر کر سکتی ہیں، جس میں سرمہ، مہندی، بالیاں، کنگن، ہار سب کچھ شامل ہے۔"[39]

یہ اور اس طرح کے دیگر کئی مقامات ہیں جہاں اگر وہ تفسیر میں اقوالِ علماء کو نقل کرتے ہیں تو غیر جانبدارانہ طور پر دلائل کی روشنی میں تفسیر کرتے ہیں اور اس میں اختلاف ہو تو ترجیح کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۷۔ تنبیہات کے طور پر فقہی مسائل کا حل:

دورانِ تفسیر آیاتِ احکام میں فوائد کا ذکر بھی کرتے ہیں اور بسا اوقات تنبیہات کے ذیل میں فقہی مسائل کا حل تجویز کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

"یاد رہے! اگر کسی ذبیحہ پر جان بوجھ کر اللہ کا نام ترک کر دیا جائے تو وہ اکثر فقہاء کے نزدیک حرام ہے، مگر جب مسلمان ذبح کرتے وقت "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ "بھول جائے تو اس کا کھانا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے خطا اور نسیان معاف کر دیا ہے۔[40]

۱۸۔ دورانِ تفسیر مسائل پر اجماع نقل کرنا:

تفسیر کرتے ہوئے بعض مسائل پر مشاہیر امت کا اگر کسی مسئلہ پر اتفاق ہو تو (جسے اجماع کہتے ہیں) اسے بھی نقل کرتے ہیں اور مسئلہ کے حل کو اس سے مقید کرتے ہیں۔ صرف نقل ہی نہیں بلکہ اجماع کے لیے ان حوالہ جات کو بھی ذکر فرماتے ہیں جہاں اس کی صراحت موجود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"آیت میں "موالی" سے مراد عصبہ ہیں اور عصبہ کی وراثت میں "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ" کا اصول مقرر ہے، یعنی اول سب سے قریبی، پھر دوسرا اور ایک حدیث میں بھی (فَلِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ) کے الفاظ ہیں، یعنی اصحاب فروض سے جو کچھ بچ جائے گا وہ عصبہ میں سے اس شخص کو ملے گا جو میت کے مردوں میں سب سے زیادہ قریب ہو گا اور اس پر علماء کا اجماع بھی ہو چکا ہے۔ (دیکھیے فتح الباری: ۶/ ۲۹۴۔ المحلٰی: ۹/ ۲۷۱۔ احکام القرآن للجصاص: ۲/ ۲۲۴)"[41]

اسی طرح ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

"امام شافعیؒ نے ان بعض لوگوں کے خلاف امت کا اجماع نقل فرمایا ہے جو کافر کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کے قائل ہیں۔"[42]

۱۹۔ الفاظ کی مختلف قراءتوں کا بیان:

تفسیر کا یہ خاصا شمار ہوتا ہے کہ اس میں قرآنِ مجید کی قراءتوں کو بیان کیا جائے۔ جس تفسیر میں اس امر کا اہتمام نا کیا گیا ہو اس میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ دورانِ تفسیر قراءتوں کے بیان کے حوالے سے دو امور غور طلب ہیں؛

اول یہ کہ مجموعی طور پر الفاظ کی مختلف قراءتوں کو بیان کیا جائے

دوم یہ کہ الفاظ کی مختلف قبائل کی لغات کو مدِ نظر رکھ کر قراءتوں کا تذکرہ کیا جائے۔

مفسر نے ان دونوں کا اہتمام کیا ہے۔ **اول صورت** کی امثلہ درج ذیل ہیں:

۱۔ آیتِ کریمہ 'وعلى الذين يُطِيْقُوْنَه' کے بارے میں لکھتے ہیں:

دوسری تفسیر صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس (رض) سے آئی ہے، انھوں نے "يُطِيْقُوْنَه" کی جگہ "يُطَوَّقُوْنَهٗ" پڑھا، جس کا معنی ہے: "يَتَجَشَّمُوْنَه" یعنی اس سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ (ابن عاشور (رض) نے "التحریر والتنویر" میں فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس (رض) نے "يُطَوَّقُوْنَه" کو بطور قراءت نہیں بلکہ "يُطِيْقُوْنَه" کی تفسیر کے طور پر پڑھا ہے"[43]

۲۔ اسی طرح آیتِ کریمہ 'حَقِيْقٌ عَلٰٓي اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَي اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"نافع کی قراءت میں ہے: "حَقِيْقٌ عَلَيَّ أَلَّا أَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ" اس صورت میں "حَقِيْقٌ" کا معنی ہے واجب، یعنی مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ عاصم کی قراءت میں وہی ہے جو ہم پڑھتے ہیں: (حَقِيْقٌ عَلٰٓي اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَي اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ) اس صورت میں "حَقِيق" کا معنی ہے قائم، ثابت"[44]

۳۔ اس کی تیسری مثال آیتِ کریمہ 'وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ' ہے جس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"بعض صحابہ کی قراءت میں "اِلَاهَتَكَ" ہے، "اِلَاهَةٌ" کا معنی عبادت ہے، یعنی وہ تجھے اور تیری عبادت کو چھوڑے رکھیں، یہ بھی اگرچہ درست ہے مگر مشہور قراءت پہلی ہی ہے۔"[45]

۴۔ اختلافِ قراءت کے بیان کی چوتھی مثال آیتِ کریمہ 'سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ' ہے جس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

"ابن عباس (رض) کی قراءت ہے "مِنْ قَطْرٍ آنٍ" یعنی ان کی قمیصیں کھولتے ہوئے تانبے سے ہوں گی، مگر پہلی قراءت "قَطِرَانٍ" متواتر اور راجح ہے۔ چہروں کو آگ سے ڈھانپنے کا خصوصاً ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ جسم کا سب سے باعزت حصہ ہے، اس کا حال یہ ہو گا تو دوسرے حصوں کا کیا حال ہو گا"[46]

جبکہ اختلافِ قراءت کی **دوسری صورت** (الفاظ کی مختلف قبائل کی لغات کو مدِ نظر رکھ کر قراءتوں کا تذکرہ کیا جائے) کی مثال 'يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهٖ' ہے جس کی تفسیر میں لکھتے ہیں؛

" يَاتِ" اصل میں "يَأْتِيْ" ہی ہے۔ زمخشری نے لکھا "يَوْمَ يَاْتِ" کی طرح "لَا أَدْرِ" بھی کہہ دیتے ہیں۔ سیبویہ اور خلیل نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یاء کو حذف کر کے اس کی جگہ کسرہ پر اکتفا کرنا ہذیل کی لغت میں بہت ہے (یعنی دوسری لغات میں بھی ہے مگر کم ہے)۔"[47]

۲۰۔ آیات و سور کے اسبابِ نزول و سیاقات کے مطابق تفسیر اور فضائل کا تذکرہ:

اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر و تشریح میں اسباب النزول کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ جس مفسر نے شان نزول کا اہتمام نہیں کیا یا پھر اس نے اس کی رعایت دورانِ تفسیر نہیں کی اس نے واضح غلطی کی۔ اسی طرح اگر آیات کے سیاقاتِ لفظی اور علاقائی (مکی و مدنی) کا خیال نا رکھا جائے تو بھی اخطاء کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ مولانا عبد السلام بن محمد نے تفسیر میں ان سب امور بالخصوص اسبابِ نزوال کا اہتمام کیا ہے اور تفسیر پر اس کے اثرات کو واضح کیا ہے۔ اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ آیتِ کریمہ "لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"عبد اللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نماز فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد سر اٹھاتے تو "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ" کے بعد یہ دعا کیا کرتے: "اے اللہ! فلاں، فلاں اور فلاں پر لعنت فرما۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: (لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ) "تیرے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں۔" [بخاری، التفسیر، باب لیس لک من الامر شئ: ۴۰۶۹]"[48]

۲۔ دوسری مثال آیتِ کریمہ 'وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا' ہے جس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ عروہ بن زبیر (رض) کے ایک سوال کے جواب میں ام المومنین عائشہ (رض) نے فرمایا کہ "بعض یتیم لڑکیاں کچھ لوگوں کی پرورش میں ہوتیں، وہ ان لڑکیوں کے مال اور جمال کی وجہ سے ان سے نکاح کر لیتے، لیکن انھیں اپنے گھر کی لڑکیاں سمجھ کر پرائے گھر کی لڑکیوں جیسا نہ تو مہر دیتے اور نہ ان

کے دوسرے حقوق ویسے ادا کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انھیں ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ اگر تم یتیم لڑکیوں سے ان کے مہر اور نفقات میں انصاف نہیں کرسکتے تو ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے، جو تمھیں پسند ہوں، نکاح کرلو۔ [بخاری، التفسیر، باب: (وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا): ۴۵۷۴]۔"[49]

جبکہ سیاقاتِ مکی و مدنی کی مثال 'وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا' ہے جس کی تفسیر میں یوں اعتراض کا جواب مکی و مدنی سیاق کو پیشِ نظر رکھ کر یوں دیتے ہیں:

"پہلی تفسیر زیادہ قریب ہے، کیونکہ سورت مکی ہے اور قتال کا حکم ہجرت کے بھی کچھ دیر بعد نازل ہوا۔" مگر حقیقت یہ ہے کہ زیادہ قریب بات یہ ہے کہ دعوت و قتال دونوں کے ساتھ جہاد مراد ہے، کیونکہ لفظ جہاد) پوری کوشش صرف کرنے (کا تقاضا بھی یہی ہے اور لفظ "کبیر" کا بھی۔ رہی یہ بات کہ یہ سورت مکی ہے، تو مکی سورتوں میں بھی قتال کا ذکر موجود ہے، اگرچہ حکمت الٰہی کے پیش نظر ہجرت سے پہلے قتال کی اجازت نہیں دی گئی"[50]

اسی طرح آیات و سور کے فضائل بھی ضمنی طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس میں اگر سورت کے فضائل کا تذکرہ کرنا مقصود ہو تو شروع میں ہی بیان کر دیتے ہیں۔ اور اگر آیت کی فضیلت بیان کرنی مقصود ہو تو اس کی تفسیر کے درمیان میں بیان کرتے ہیں۔ نیز کسی بھی سورت سے متعلقہ معلومات کو وہ شروع میں ہی بیان کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ آلِ عمران کے شروع میں لکھتے ہیں:

"سورۃ آل عمران کی فضیلت سورۃ بقرہ کی فضیلت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ اس سورت کے مدنی ہونے پر مفسرین کا اتفاق ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی ۸۳ آیتیں وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ۹ھ میں رسول اللہ (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ (فتح القدیر) مگر ابن عاشور کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وفد تقریباً ۳ھ میں آیا ہے، کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مدنی سورتوں کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ نزول کے اعتبار سے کل سورتوں میں اس کا نمبر ۴۸ واں ہے۔ ۹ھ میں نازل ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی غلطی کا باعث یہ ہے کہ وفود اس سال آئے تھے، جبکہ وفد نجران پہلے آچکا تھا۔ [التحریر والتنویر]-------------- آپ نے یہ اور دوسرے دلائل پیش کیے جس پر وہ خاموش ہو گئے، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔"[51]

۲۱۔ اصولی نکات، قواعدِ عربیہ کا ذکر:

تفسیر میں مؤلف نے اکثر مقامات پر اصولی و لغوی قواعد و ضوابط کو بیان کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے اور ان کا انطباق بھی پیش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی یہ تفسیر ممتاز حیثیت کی حامل ہے کہ اس میں اصول و ضوابطِ عربیہ کا انطباق بلاواسطہ قرآنی آیات پر کیا گیا ہے۔ ان مختلف قواعد کی امثلہ درج ذیل ہیں:

۱۔ فواصل کی وضاحت: آیتِ کریمہ 'عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"الْمُتَعَالِ "(جو اصل میں "عَلَا یَعْلُوْ "کے باب تفاعل سے "مُتَعَالِوٌ "تھا) میں حروف زیادہ ہونے سے معنی میں مبالغہ مراد ہے۔ "مُتَعَالِوٌ "کی "واوَ "کو "یاء "سے بدلا تو "مُتَعَالِیٌ "ہوا، پھر "یاء "کو آیات کے آخری الفاظ (جنھیں اصطلاح میں فاصلہ، فواصل کہتے ہیں) کی موافقت اور تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا۔[52]

۲۔ اصولِ فقہ کا قاعدہ: آیتِ کریمہ 'فَاجْتَنِبُوْهُ' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"امر کا صیغہ فرض کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ اس سے اجتناب فرض ہے، لہٰذا اپینا حرام ہے۔"[53]

۳۔ نسبتی معنی کے توضیح: آیتِ کریمہ 'وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ' کی تفسیر میں مبالغہ کے صیغہ کی معنویت کا ضابطہ یوں بیان کرتے ہیں:

"فَعَّالٌ "کا وزن ہمیشہ مبالغہ کے لیے نہیں آتا، بلکہ بعض اوقات صرف نسبت کے لیے یعنی "ذُوْشَيْءٍ "(کسی چیز والا) کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے "سَمَّانٌ "(گھی والا)، "قَطَّانٌ "(روئی والا)، "حَدَّادٌ "(لوہار)، تَمَّارٌ (کھجوروں والا)، مطلب یہ ہے کہ یہاں "ظَلَّامٌ "مبالغے کے لیے نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات عالی ہے جس کی طرف ظلم کی نسبت بھی نہیں ہو سکتی۔"[54]

۴۔ اسمِ اشارہ میں حرفِ خطاب کی وضاحت: آیتِ کریمہ 'قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ' میں لفظِ 'اَرَءَيْتَكَ' کی وضاحت بایں الفاظ کی ہے؛

"اَرَءَیْتَکَ "اصل "أَرَ أَیْتَ "ہی ہے، کاف حرف خطاب ہے، جو مخاطب کے مطابق بدلتا رہتا ہے، مثلاً مخاطب واحد مذکر ہو تو "أَرَ أَیْتَکَ "، تثنیہ مذکر ہو تو "أَرَ أَیْتَکُمَا "اور جمع مذکر ہو تو "أَرَ أَیْتَکُمْ "، معنی سب کا یہی ہے کہ "کیا تو نے دیکھا "مگر مراد ہوتی ہے "أَخْبِرْنِیْ "یعنی "مجھے بتا۔"[55]

۵۔ اسبابِ منع صرف کا تذکرہ: مثلاً یاجوج وماجوج کی نحوی حیثیت اور اعراب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یاجوج اور ماجوج عجمی نام ہیں، اس لیے عجمہ اور تانیث (مجوس کی طرح قبیلہ ہونے) کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔ اگر انھیں عربی مانا جائے تو یاجوج بروزن "یَفْعُوْلٌ "مثلاً "یَرْبُوْعٌ "اور ماجوج بروزن "مَفْعُوْلٌ "مثلاً "مَعْقُوْلٌ "ہوگا اور ان کا ماخذ "اَجَّ یَؤُجُّ "ہوگا۔ "اَجَّ الظَّلِیْمُ "کا معنی نر شتر مرغ تیز دوڑا اور "اَجَّتِ النَّارُ "آگ بھڑک اٹھی۔ غرض یاجوج اور ماجوج کا اشتقاق ایک ہی مادے سے ہے اور اس کے مفہوم میں تیزی اور اشتعال شامل ہے اور یہ لفظ معرفہ اور تانیث کی وجہ سے غیر منصرف ہیں۔"[56]

۶۔ عدد و معدود کی وضاحت: مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ' کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جو چیز شمار کی جارہی ہے، وہ مذکر ہو تو عدد مؤنث ہوتا ہے، اس لیے "اربعہ "کی وجہ سے ترجمہ "چار مرد "کیا ہے۔"[57]

۷۔ نقدِ رجال / اصولِ حدیث کا قاعدہ: مفسر نے آیاتِ حجاب میں بہت ہی مفصل کلام کی ہے۔ فریقین کے دلائل ذکر کرتے ہوئے حدیثِ عبد اللہ بن امّ مکتوم "أَفَعَمْيَاوَانِ أَنْتُمَا ؟ نقل کرکے اس کی حیثیت بارے لکھتے ہیں:

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ثابت ہی نہیں، چنانچہ شیخ البانیؒ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں ایک راوی نبہان مولیٰ ام سلمہ ہے، اسے تقریب میں " مقبول " کہا گیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے تقریب کے مقدمہ میں خود فرمایا ہے کہ جس راوی کے متعلق وہ مقبول کہیں، اگر کسی حدیث میں اس کی متابعت ہو تو وہ مقبول ہے، ورنہ " لین الحدیث " ہے۔ اس لیے یہ روایت ضعیف ہے۔[ہدایۃ المستنیر بتخریج ابن کثیر]"[58]

۲۲۔ نسخ کا بیان، اصولی بحث اور ناسخ و منسوخ کا ذکر:

دورانِ تفسیر نسخ سے متعلقہ آیات کے ذیل میں نسخ پر بہترین بحث کی ہے اور اس میں قدیم و جدید تمام نکتہ ہائے نظر کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تفسیر کا یہ خاصہ بھی ہے کہ اس میں انہوں نے متقدمین اور متاخرین کی آراء کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اور ان کا ماحصل اس کی زینت بنایا ہے۔ چنانچہ نسخ کی بحث کے بارے میں ان کی تصریحات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

ا۔ نسخ کا معنی: بعد میں آنے والے حکم کے ساتھ پہلے کسی حکم کو ختم کر دینا، جیسے پہلے بیت المقدس قبلہ مقرر ہوا، پھر بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا اور جیسے ہماری شریعت میں پہلی شریعتوں کے بہت سے احکام منسوخ کر دیے گئے۔

۲۔ نظریہ بداء: یہودی نسخ کے منکر تھے، اسی لیے انھوں نے عیسیٰ) علیہ السلام (کو جھٹلایا کہ انھوں نے تورات کے بعض احکام کیوں منسوخ کیے۔ قرآن پر بھی انھوں نے اعتراض کیا کہ جب پہلا حکم اللہ تعالیٰ کا تھا اور درست تھا تو وہ منسوخ کیوں ہوا ؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے کئی جواب دیے۔

"پہلے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا حکم درحقیقت ہوتا ہی اتنی مدت کے لیے ہے، نسخ اس مدت کے ختم ہونے کا اعلان ہے۔ اس وقت تک وہ پہلا حکم عین حکمت تھا، بعد میں اس جیسے یا اس سے بہتر دوسرے حکم کی ضرورت تھی تو وہ جاری کر دیا گیا۔ کائنات میں ہر وقت اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ نطفہ سے علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں، پھر جنین، پھر بچپن، جوانی، بڑھاپا، موت اور قیامت سب نسخ ہی کی صورتیں ہیں۔ مختلف موسم مثلاً سردی، پھر بہار، پھر گرمی، پھر برسات، اسی طرح رات دن کا چکر اس کی مثالیں ہیں۔ طبیب کا مریض کے لیے ایک نسخہ تجویز کرنا، پھر نئی صورت حال کے لیے دوسرا نسخہ تجویز کرنا بھی اس کی مثال ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلا نسخہ غلط تھا۔ ایک جواب اس اعتراض کا یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنا حکم منسوخ نہ کر سکتا ہو تو وہ عاجز ٹھہرا، چنانچہ فرمایا" : کیا تمھیں معلوم نہیں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

مزید فرمایا " : کیا تمہیں معلوم نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔ " وہ بادشاہ ہی کیا ہوا جو پہلے حکم کی جگہ نیا حکم نافذ نہ کر سکے۔ "[59]

۳۔ نسخ کی کیفیات: قرآن کے ساتھ قرآن منسوخ ہوسکتا ہے اور سنت بھی، اسی طرح سنت کے ساتھ سنت منسوخ ہوسکتی ہے اور قرآن بھی، کیونکہ دونوں وحی الٰہی ہیں اور وحی الٰہی کے ساتھ وحی الٰہی منسوخ ہوسکتی ہے۔

۴۔ نسخ کی مذکورہ تمام اقسام کی امثلہ۔[60]

۵۔ نسخ کہاں کہاں ہوتا ہے؟ جواب: نسخ صرف ان احکام میں ہوتا ہے، خبر دی جارہی ہو تو نسخ نہیں ہوگا۔

جہاں تک تعلق ہے ناسخ و منسوخ آیات کا تو دورانِ تفسیر سب سے پہلے ان آیات کے ذیل میں نسخ کی ہی بحث کرتے ہیں جن کے بارے میں ناسخ یا منسوخ ہونے کا کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۴۰ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"رہ گیا نان و نفقہ اور رہائش کا منسوخ ہونا تو جو علماء منسوخ بتاتے ہیں وہ سورۃ نساء کی آیت میراث سے منسوخ بتاتے ہیں، جو سورۃ بقرہ کے بعد اتری ہے۔ اس لیے زیر تفسیر آیت کسی طرح بھی پہلی آیت کے ساتھ منسوخ نہیں۔ اگر اس کا کچھ حصہ منسوخ ہے بھی تو سورۃ نساء کے ساتھ منسوخ ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں، اس میں عدت بیان ہی نہیں ہوئی، بلکہ میت کے اولیاء کو وصیت کا ذکر ہے کہ وہ عورت کی دل جوئی کی خاطر اور مرنے والے سے اظہار محبت و اخلاص کے طور پر چار ماہ دس دن کے بعد مزید سات ماہ بیس دن اسے اپنے شوہر کے گھر میں رہنے دیں۔ ہاں اگر عورت چار ماہ دس دن یا وضع حمل کے بعد اپنی مرضی سے اس گھر سے منتقل ہونا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آیت میراث کے باوجود چار ماہ دس دن اس گھر میں رہنے کا لازمی حکم دے سکتا ہے تو سال کے باقی ماندہ دن اختیاری طور پر وہاں رہنے کی اجازت کا حکم بھی دے سکتا ہے اور یہ آیت میراث کے خلاف نہیں۔ یہ رائے امام مجاہد بن جبر، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (رض) اور دوسرے کئی اہل علم کی ہے۔ حافظ ابن کثیر (رض) نے بھی اسے قوی قرار دیا ہے اور اس سے قرآن کی آیات کی ترتیب کا حسن بھی باقی رہتا ہے۔"[61]

۲۳۔ فلاسفہ کے باطل نظریات کا رد:

مفسر نے بہت سارے مقامات پر تفسیرِ باطل اور اسی طرح باطنی مفسرین کی تفسیرات و استدلالات کا خوب رد کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے متکلمین اور فلاسفہ کے نظریات کا بھی خوب ابطال کیا ہے۔ ان کے نزدیک کتبِ تفاسیر میں اس قسم کے نظریات کا وجود بذاتِ خود ایک معمہ ہے جو بعتی فرقوں کی کارستانی کا نتیجہ اور حقیقتاً ان کی تفسیر کے بطلان کا باعث ہے۔ الغرض اہلِ یونان و فلاسفہ کا اگر کسی مفسر پر غلبہ محسوس ہوا اور اس کے اثرات کو تفسیر میں موجود پایا تو اس پر تنبیہ اور اس کا رد کرتے ہیں۔ اس کی مثال ' فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَنْ بُورِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یونانی فلسفے سے متاثر بہت سے مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآن و حدیث میں بیان کی گئی بہت سی باتوں کا انکار کردیا، یا ان کی تاویل کی، مثلاً قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ وہ جب چاہے جہاں چاہے نور یا نار کے پردے میں مجوب رہ کر نزول فرماتا ہے، وہ رات کے پچھلے پہر آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ قیامت کے دن زمین پر نزول فرمائے گا، اس دن اس کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ وہ جب چاہے، جو چاہے، جس سے چاہے کلام کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ ہمارے ان مفسرین نے ان سب باتوں کو اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی قرار دے کر ان کا انکار کردیا، یا ان کی ایسی تاویل کی جو انکار سے بھی بدتر ہے۔ ان حضرات نے یہ نہ سوچا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے بڑھ کر اللہ کی شان نہ سمجھ سکتے ہیں، نہ بیان کرسکتے ہیں۔ اس مقام پر " مَنۡ فِی النَّار " سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے موسیٰ) علیہ السلام (یا کوئی اور مراد لینے کے پیچھے بھی یہی مشکل کار فرما ہے۔"[62]

۲۴۔علاقائی(جغرافیہ) تقسیم کی توضیح:

تفسیر میں جن آیات کے اندر کسی علاقہ یا بستی وغیرہ کا تذکرہ آئے تو اس کی جغرفیائی حدود اور اس کا محل وقوع بھی بیان کرتے ہیں۔ تاکہ اس جگہ کی درست تعیین ہوسکے۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ 'وَلَقَدۡ كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"الۡحِجۡرِ" شام اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک مقام ہے، جو صالح (علیہ السلام) کی قوم ثمود کے لوگوں کا مرکز تھا، یہ جگہ خیبر سے تبوک جانے والی سڑک پر واقع ہے اور اب "مدائن صالح "کے نام سے مشہور ہے۔ یہ علاقہ "العُلاء "سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حجاز سے شام کو جو قافلے جاتے ہیں وہ لازماً یہاں سے گزر کر جاتے ہیں اور یہ اس ریلوے لائن کا ایک سٹیشن بھی ہے جو ترکوں کے زمانہ میں مدینہ سے دمشق کو جاتی تھی"[63]

۲۵۔نحوی اعراب(ترکیبِ لفظی) کا بیان:

دورانِ تفسیر آیاتِ قرآنیہ کی نحوی ترکیب کی طرف بھی اشارہ کردیتے ہیں۔ جس سے آیات کا اعراب اور اس کے الفاظ کی حیثیت متعین ہوجاتی ہے جو تفسیر کی صحت کا قرینہ بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'اَوَلَمۡ نَـنۡهَكَ' کی تفسیر کے دوران لکھتے ہیں:

'نَهٰى يَنۡهٰى' سے جمع متکلم جحد معلوم ہے، "نَنۡهٰى "کا الف "لَمۡ "کی وجہ سے حذف ہوگیا، کاف ضمیر مفعول بہ ہے۔"[64]

اسی طرح 'وَاِنۡ كَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ لَظٰلِمِيۡنَ' کے بارے لکھتے ہیں:

یہ "اِنۡ "اصل میں "اِنَّ "تھا، اس کا اسم ضمیر شان "ہٗ "محذوف ہے، اس کی دلیل اور سبب وہ لام ہے جو "ظَالِمِيۡنَ "پر آیا ہے، جو "كَانَ "کی خبر ہے۔ "اَلۡاَيۡكُ "اسم جنس ہے، درختوں کے جھنڈ، زیادہ ہوں یا ایک، جیسے

"تمرٌ "اسم جنس ہے۔ تاء وحدۃ کے اظہار کے لیے ہے، اس لیے "الْاَیْکَۃِ "کا معنی ہے ایک جھنڈ، جیسے "تَمْرَۃ " ایک کھجور۔[65]

نحوی ترکیب یا تشکیل کے دوران اکثر الفاظِ مرکبہ جو عاملہ ہوتے ہیں ان کی وضاحت بھی کرتے ہیں تاکہ ان کا معنٰی و عمل واضح ہو سکے۔ مثال کے طور پر 'فَنِعِمَّا ھِیَ' کی درج ذیل توضیح کرتے ہیں؛

"یہ اصل میں "نِعْمَ مَا "ہے جس میں "مَا "بمعنی "شَیْءٌ "ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "تو یہ اچھی بات ہے"[66]

تیسرا امر اس حوالے سے یہ ہے کہ الفاظ کی تشکیل یعنی حرکات (نصبی، جرّی، رفعی حالتوں) کو متعین کر دیتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات الفاظ کا عمومی تلفظ بھی بتلا دیتے ہیں۔ اول الذکر کی مثال یَحُلُّ کُمْ ہے جس کے بارے لکھتے ہیں:

"یَحُلُّ "اصل میں "یَحْلُوْ "تھا۔ "اقُ۔تُلُوْا "(امر) کے جواب میں مجزوم ہونے کی وجہ سے اس کی واؤ اور "تَکُوْنُوْنَ "کا نون گر گئے"[67]

جبکہ ثانی الذکر کی مثال "مَسَّنِیَ الضُّرُّ" ہے جس کی تصریح یوں کرتے ہیں:

"اَلضَّرُّ "اور "اَلضُّرُّ "میں فرق یہ ہے کہ ضاد کے فتحہ کے ساتھ "ضَرٌّ "نفع کی ضد ہے، اس سے مراد کوئی بھی نقصان ہے، مالی ہو یا جانی یا کوئی اور، جبکہ ضاد کے ضمہ کے ساتھ "ضُرٌّ "سے مراد آدمی کی جسمانی بدحالی ہے، مثلاً بیماری، لاغری یا بڑھاپا وغیرہ۔"[68]

اسی طرح اگر الفاظ کے معنٰی و مفہوم سے واضح ہو کہ ان کی ترکیب میں کوئی لفظ محذوف ہے تو اس کی توضیح بھی کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال 'حَقِیْقٌ عَلٰٓی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ' ہے جس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حَقِیْقٌ "مبتدا محذوف" اَنَا "کی خبر ہے، یعنی میں اس بات پر قائم ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں"[69]

۲۶۔ تائے مدورہ کی توضیحات اور معنویت:

الفاظ کے آخر میں آنے والی تاء مدورہ (گول) کی کئی اقسام ہیں اور ان کی معنویت بھی الگ الگ ہے۔ اکثر مترجمین و مفسرین اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہیں۔ تاہم تفسیر القرآن الکریم میں اس امر کی خاص رعایت رکھی گئی ہے بلکہ ترجمہ میں بھی اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت درج ذیل امثلہ سے ہوتی ہے۔

تاء برائے تحقیر: آیتِ کریمہ ' خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ **نُّطْفَةٍ** ' میں مفسر نے تاء برائے تحقیر قرار دی ہے۔[70]

تاء برائے بیانِ حالت: آیتِ کریمہ ' یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَةٍ ' میں **"مُرْضِعَةٍ"** بابت لکھتے ہیں:

"عورت جس وقت بچے کو دودھ پلا رہی ہو اس وقت اسے "مُرْضِعَةٌ "کہتے ہیں۔ وہ صفات جو صرف عورتوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ساتھ "تاء "نہیں لگائی جاتی، مثلاً "حَاءِضٌ، حَامِلٌ، مُرْضِعٌ "ان کے ساتھ "تاء "اس وقت لگائی جاتی ہے جب وہ اس کام میں مصروف ہوں، مثلاً کوئی بھی عورت جو کسی بھی وقت دودھ پلاتی ہے "مُرْضِعٌ "

کہلائے گی، "مُرْضِعَۃٌ "اس وقت ہو گی جس وقت وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ مطلب اس وقت کی ہولناکی بیان کرنا ہے کہ دودھ پلانے والی عورت، جسے اپنے بچے سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی، اس زلزلہ کی وجہ سے عین دودھ پلاتے ہوئے ایسی دہشت زدہ ہو گی کہ اسے اپنے بچے تک کی ہوش نہیں ہو گی۔[71]

۲۷۔ انتشارِ ضمائر کا حل:

عربی زبان کے جملوں میں ضمیر (وہ اسم جو اسمِ ظاہر کی جگہ استعمال کیا جائے) کا مرجع صحیح متعین کرنے سے ہی ترجمہ درست ہوتا ہے۔ اگر ضمیر کا مرجع درست متعین نا ہو تو ترجمہ میں غلطی کا مکمل احتمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مفسر (عبد السلام بن محمد) نے ضمائر کو ان کے حقیقی مراجع کے ساتھ متعین بھی کیا ہے اور درست ترجمہ بھی۔ اس کی امثلہ ملاحظہ ہوں؛

ا۔ آیتِ کریمہ "کُتِبَ عَلَیْہِ اَنَّہٗ مَنْ تَوَلَّاہُ" کی ضمائر کے بارے لکھتے ہیں:

"تَوَلّٰی یَتَوَلّٰی "دوست بنانا۔ "اَنَّہٗ "میں ضمیر "ہٖ "شیطان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پہلے "عَلَیْہِ "میں ضمیر شان کی ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ واقعہ یہ ہے۔ اس سے مراد بات میں پختگی پیدا کرنا ہوتا ہے۔"[72]

۲۸۔ حرف نداء و منادیٰ و الف ندبہ کے حذف و ذکر کی صراحت:

اہلِ عرب سے مسموع ہے کہ وہ کسی کو پکارنے یا آواز دینے کے لیے مخصوص الفاظ کے ساتھ حروفِ نداء کا اضافہ کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو اس طرح ان کا اہتمام نہیں کیا جاتا تاہم ان کے ہاں اس کا استعمال شائع ہے۔ البتہ بسا اوقات ان حروف کو وہ حذف بھی کر دیتے ہیں کیونکہ ان کا اصول ہے کہ "الحذف فی الکلام کالمذکور (کلام میں محذوف الفاظ ایسے ہیں جیسے مذکور ہوں)"۔ اس لیے قرآنِ مجید میں بھی اکثر تو حروفِ نداء لائے گئے ہیں تاہم بعض مقامات پر ان کو حذف بھی کیا گیا ہے۔ ان مقامات کی تفسیر کے دوران (مفسر عبد السلام بن محمد) نے اس امر کا خاص اہتمام کیا ہے کہ ان کی توضیح کرتے ہیں۔ امثلہ درج ذیل ہیں:

ا۔ آیتِ کریمہ 'قَالَ ابْنَ اُمَّ' میں لکھتے ہیں:

"ابْنَ اُمَّ "اصل میں "یَا ابْنَ اُمِّیْ "تھا، حرف ندا یاء حذف کر دیا اور "اُمِّیْ "کی یاء کو الف سے بدل دیا تو "ابْنَ اُمَّا "بن گیا، پھر مزید تخفیف کے لیے الف بھی حذف کر دیا تو "ابْنَ اُمَّ 'بن گیا۔"[73]

۲۔ اسی طرح آیتِ کریمہ 'یٰاَبَتِ افْعَلْ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں؛

"یہ اصل میں "یَا اَبِیْ "تھا "اے میرے باپ! "یاء حذف کر کے اس کی جگہ تاء تانیث لائی گئی اور باء کا کسرہ اس کی طرف منتقل کر دیا۔ یہ اظہار محبت کا ایک طریقہ ہے، جیسے اردو میں "ابا "کو "ابو "کہہ دیتے ہیں۔"[74]

کسی تو مدد کے لیے پکارنا ہو یا اس کو تعجب کی حالت میں آواز دینی ہو تو اہلِ عرب اسے 'ندبہ' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بھی نداء و منادیٰ کی ایک ذیلی قسم ہے۔ قرآنِ مجید میں اس قبیل کے جو مقامات ہیں ان کی بھی صراحت کرتے ہیں۔ بطورِ مثال 'قَالَتْ یٰوَیْلَتٰٓی' ہے۔ تفسیر میں لکھتے ہیں:

"امام طبری (رض) نے فرمایا کہ "یَاوَیْلَتَا" کا کلمہ عرب کسی چیز پر تعجب اور اسے انوکھا سمجھنے کے وقت بولتے ہیں، چنانچہ تعجب کے وقت کہتے ہیں: "وَیْلُ اُمِّہٖ مَا اَرْجَلَہٗ" "اس کی ماں ہلاک ہو، وہ کس قدر مرد ہے۔" باقی الف کے متعلق طبری کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ الف "ندبہ" کا ہے اور تاء کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ "وَیْلٌ" کے بعد والا الف ندبہ اتنا واضح اور لمبا نہیں ہو سکتا جتنا درمیان میں تاء کے اضافے سے ہو سکتا ہے۔"[75]

۲۹۔ الفاظ کی تعلیل اور اصل کا بیان:

موصوف تفسیرِ قرآن میں بسا اوقات کسی لفظ کی اصل اور اس میں ہونے والی تعلیل کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی تفسیر میں جابجا تفسیری نکات کے ساتھ ساتھ صرفی و لغوی ابحاث کے ذیل میں یہ امور ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

ا۔ لفظِ 'الصراط' کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الصِّرَاطَ" اس کا اصل "سِرَاطٌ" ہے، جو "سَرَطَ یَسْرُطُ سَرَطًا، سَرَطَانًا (ن، ع) سے مشتق ہے، سین کو صاد سے بدل دیا گیا، اس کا معنی نگلنا ہے۔ "سِرَاطٌ" کا معنی واضح راستہ ہے، کیونکہ اس پر چلنے والا اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے نگلا ہوا کھانا غائب ہو جاتا ہے۔"[76]

۲۔ لفظِ 'المستقیم' کے وضاحت بایں الفاظ کرتے ہیں:

"الْمُسْتَقِیْمَ" "قَامَ یَقُوْمُ" میں سے باب استفعال سے اسم فاعل ہے، جو اصل میں "مُسْتَقْوِمٌ" ہے، معنی اس کا وہی ہے جو "قَامَ یَقُوْمُ" کا ہے۔ حروف کی زیادتی سے معنی میں تاکید پیدا ہو گئی، بالکل سیدھا راستہ۔"[77]

۳۔ آیتِ کریمہ 'اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی تَقْوٰی۔۔۔ الخ' میں وارد الفاظ کی تعلیلات یوں بیان کرتے ہیں:

"شَفَا" کنارا "جُرُفٍ" ندی نالے یا دریا کا کنارا جس کے نیچے سے پانی مٹی بہا کر لے گیا ہو اور وہ بس گرنے ہی والا ہو، کیونکہ اس کے نیچے کوئی بنیاد ہی نہیں کہ ٹھہر سکے، صرف مٹی کا نیچے سے کھوکھلا تودا ہے۔ "هَارٍ" اسم فاعل ہے "هَارَ يَهَارُ (خَافَ يَخَافُ)" سے ھار یَھُوْرُ (قَالَ یَقُوْلُ)" سے۔ اصل "هَاءِرٌ" تھا، جیسا کہ "خَاءِفٌ" یا "قَاءِلٌ"، پھر اس میں قلب واقع ہوا تو "هَارِیٌ" ہو گیا اور "رَاضِیٌ" سے یاء گرنے کے بعد "رَاضٍ" کی طرح "هَارِیٌ" سے "هَارٍ" ہو گیا۔ "فَانْهَارَ" باب انفعال "اِنْهِیَارٌ" سے ماضی معلوم ہے۔[78]

۳۰۔ تسہیل (جوازی و وجوبی) و ادغام اور تخفیف کا بیان:

دورانِ تفسیر موصوف صرفی قواعد کے مطابق ان الفاظ کی ساخت پر بھی گفتگو کرتے ہیں جن میں ہمزہ شامل ہو۔ اس لحاظ سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمزہ کی ادائی کو آسان کرنے کے لیے اہلِ عرب اس کو مختلف حروف سے بدل دیتے ہیں۔ اگر ہمزہ سے قبل فتحہ (زبر) ہو تو الف سے، ضمّہ (پیش) ہو تو واؤ سے اور اگر کسرہ (زیر) ہو تو یاء سے۔ اس کو ان کی زبان میں تسہیل کہتے ہیں۔ اس

میں جواز ہوتا ہے تاہم اگر دو ہمزات اکٹھے آجائیں تو ایک کو وجوباً تسہیل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مفسّر (عبد السلام بن محمد) اس پر خاصی توجہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔ تسہیل کی مثال لفظِ 'وَالصّٰبِـــِٕیْنَ' ہے جس کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" یہ " صَابِئٌ "کی جمع ہے، اس کا مادہ ص، ب، ء ہے، جو شخص ایک دین سے دوسرے دین کی طرف نکل جائے، گویا یہ " صَبَأَ نَابُ الْبَعِیْرِ " سے ہے، جس کا معنی ہے اونٹ کی کچلی نکل آئی۔ ایک قراءت میں " صابین " ہے، وہ اسی " صابئین " میں سے ہمزہ کی تخفیف سے ہے اور بعض نے کہا بلکہ وہ " صَبَا یَصْبُوْ " سے ہے، جس کے معنی مائل ہونا ہیں، یعنی وہ ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہوگیا۔[79]

۲۔ ادغام کی مثال لفظِ 'فَادّٰرَءْتُمْ' ہے جس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"فَادّٰرَءْتُمْ اصل میں " تَدَارَأْتُمْ " تھا، باب تفاعل کی تاء کو دال میں بدل کر دال میں ادغام کر دیا ادغام کرنے سے شروع والا حرف مدغم ساکن ہوا تو ساکن کو پڑھنے کے لیے شروع میں ہمزہ لائے، پھر شروع میں فاء آنے سے ہمزہ تلفظ سے ساقط ہوگیا، لکھنے میں موجود ہے۔[80]

۳۔ جبکہ تخفیف کی مثال لفظِ 'الطَّاغُوْتِ' ہے۔ اس کی بابت یوں صراحت کرتے ہیں:

"الطَّاغُوْتِ: یہ "طَغٰی یَطْغٰی طُغْیَانًا " سے صیغہ مبالغہ "فَعَلُوْتٌ " کے وزن پر ہے، جیسے جبروت اور ملکوت ہے۔ " فَعَلُوْتٌ " کے وزن پر "طَغَیُوْتٌ "تھا، پھر تخفیف کے لیے اس میں قلب کیا گیا، یاء کو پہلے اور غین کو بعد میں کر دیا گیا "طَیَغُوْتٌ "ہو گیا، پھر یائے متحرکہ کا ما قبل مفتوح ہونے کی وجہ سے یاء کو الف سے بدل دیا گیا تو "طَاغُوْتٌ " بن گیا، جس کا وزن "فَلَعُوْتٌ " ہے۔ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، جس کا معنی ہے کسی چیز کا اپنی حد سے آگے بڑھ جانا۔ طاغوت میں "واوَ "اور "تاء "مبالغہ کے لیے ہیں، یعنی جو اپنی حد سے بہت زیادہ آگے بڑھ جائے۔ تمام باطل معبود طاغوت ہیں، کیونکہ انھیں حد سے بڑھا کر اللہ تعالیٰ کے برابر کر دیا گیا ہے۔ شیطان کو بھی اسی لیے طاغوت کہتے ہیں۔ جو شخص لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی بندگی اور اطاعت کرواتا ہے وہ بھی طاغوت ہے۔[81]

۱۳۔ بلاغتی نکات کا بیان:

تفسیر القرآن کے دوران مؤلف آیاتِ قرآنیہ میں پنہاں بلاغتی نکات و فوائد کو بھی بیان کرتے ہیں۔ الفاظ میں موجود استعارات اور ان میں استعمال کی گئی تشبیہات کو واضح کرتے ہوئے تفسیرِ قرآن کی معنویت کو بھرپور انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے استعارات، تشبیہات اور التفات وغیرہ کے موقعوں پر بہت ہی بہترین انداز سے تفسیر کرتے ہیں۔ ان کی امثلہ ملاحظہ ہوں۔

الف۔ استعارہ و تشبیہ کا بیان: آیت کریمہ "وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" "سَکَتَ "کا لفظی معنی "خاموش ہونا "ہے۔ یہ ایک پر لطف استعارہ ہے، گویا یہاں غصے کو ایسے آدمی سے تشبیہ دی ہے جو مسلسل موسیٰ (علیہ السلام) کو بھڑکا رہا تھا، جب وہ انھیں بھڑکانے سے خاموش ہو گیا تو موسیٰ (علیہ السلام) بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ قرآن مجید میں جو لطف یہاں "سَکَتَ "کا لفظ دے رہا ہے کوئی دوسرا لفظ، مثلاً " سَکَنَ "(ساکن ہو گیا) وغیرہ کبھی یہ لطف نہ دیتا۔"[82]

اسی طرح **تشبیہ کو وجوہات** بھی بیان کرتے ہیں جن کو آیتِ کریمہ "کلّما اَوقدوا ناراً" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔[83]

ب: تاکید مدح بمعنٰی الذم: آیتِ کریمہ "قَالَ بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ "کی ذیل میں لکھتے ہیں:

"بلاغت میں اسے "تَاْکِیْدُ الْمَدْحِ بِمَایُشْبِہُ الذّمّ "کہا جاتا ہے، یعنی ایسی تعریف جو بظاہر مذمت ہو، جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

وَلَا عَیْبَ فِیْهِمْ غَیْرَ أَنَّ سُیُوْفَهُمْ
بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكِتَاءِبِ

"یعنی ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ ان کی تلواروں میں لشکروں کو کھٹکھٹانے کی وجہ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ دشمنوں کے مقابلے کی وجہ سے تلواروں میں دندانے پڑ جانا کوئی عیب نہیں، تو جن کا عیب یہ ہے ان کی خوبیوں کا حال کیا ہو گا۔"[84]

ج۔ التفات کا بیان اور اس کا اثر: سورہ الفاتحہ کی آیتِ کریمہ 'اِیَّاکَ نَعْبُدُ' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد غائب کے صیغے کے ساتھ کی گئی ہے، " اِیَّاکَ نَعْبُدُ " اور اس کے بعد کی آیات میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر لیا گیا ہے، اسے التفات کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اسے اس کا قرب اور اس کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، اب وہ براہ راست خطاب کے صیغے سے اپنی درخواست پیش کرتا ہے۔"[85]

اسی طرح اس کی دوسری مثال آیتِ کریمہ 'وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَھُوْرًا' کی تفسیر میں درج ہے:

"یہاں پھر غائب سے متکلم کی طرف **التفات ہے۔**"[86]

(۵)۔ خاتمۃ البحث و نتائج تحقیق:

مذکورہ بالا تحقیق کی روشنی میں درج ذیل نتائج بر آمد ہوتے ہیں:

ا۔ تفسیر القرآن الکریم میں مفسر (عبد السلام بن محمد) نے زبردست اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے اور اس میں دیگر کئی اردو تفاسیر کی نسبت تحقیقی ذوق اور اسلوب غالب اور واضح ہے۔

۲۔ یہ تفسیر بالماثور کی خاص طور پر اور تفسیر بالرائے محمود (یا ایک خاص مکتبِ فکر کے مطابق تفسیرِ صحیح) کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں مفسر نے قرآن، احادیثِ صحیحہ، ثابت شدہ اقوالِ صحابہ، مفسرین کی علمی و تحقیقی آراء، فقہاء کے بہترین اجتہادات، لغت کی مسلمہ کتب و آراء کی روشنی میں تفسیر کی ہے۔

۳۔ اسی طرح ثانوی حیثیت میں اشعارِ عرب و عجم سے استشہاد و تردید، اجماعی مسائل کا تذکرہ، فقہ الواقع سے جڑے مسائل کا فقہاء و مستند علماء کے استنباطات کی روشنی میں حل، غیر ضروری طوالت سے اجتناب، حقیقی اور مقصود بہا معانی القرآن کا ذکر اس تفسیر کے خصائص ہیں۔

۴۔ اضافی خوبیوں میں جغرافیائی معلومات، فلاسفہ کا رد، صرفی و نحوی تحلیل اور سب سے بڑھ کر اصولی (اصولِ حدیث، اصول فقہ و علومِ القرآن) کی ابحاث کو مستند کتب کی روشنی میں ذکر کرتے ہیں اور ان کا صحیح انطباق بھی پیش کرتے ہیں۔

۵۔ آیاتِ احکام کی تفسیر و توضیح میں غیر جانبدارانہ طور پر مسائل کا تذکرہ و حل پیش کرتے ہیں اور درست مسئلہ کی تعیین میں حتی الوسع دلائل کی پرکھ سے کام لے کر نتیجہ پیش کرتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

[1] یہ مقالہ حصہ دوم ہے۔ حصہ اول میں ترجمۃ القرآن الکریم از محمد بن عبد السلام بھٹوی کے خصائص و ممیزات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:
یاسر فاروق، **ترجمۃ القرآن از عبد السلام بن محمد کے خصائص و ممیّزات اور تفسیر القرآن الکریم کا تحقیقی مطالعہ (حصہ اول)**؛ شش ماہی، التفسیر، کراچی، جلد: ۱۴،
شمارہ: ۳۵، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء، صفحات: ۴۰ تا ۶۱۔

Yasir Farooq, Characteristics & Qualities of Translation by ʿAbdul Salām Ibn Muḥammad and Research Study on Tafsīr al-Qur'ān al-Karīm (Part: 01), "Bi-annual Al-Tafseer", Karachi, Vol: 14, Issue: 35, January – June 2020, PP: 40-61.

[2] ایضاً

Ibid.

[3] بھٹوی، عبد السلام بن محمد، تفسیر القرآن الکریم، مکتبہ دار الاندلس، لاہور، ۲۰۱۴ء، جلد ۱، ص ۱۷

Ibid.

[4] جلد ۱، ص ۱۷

Ibid., Vol: 01, P:17.

[5] جلد ۲، ص ۲۹۱

Ibid., Vol: 02, P:291.

[6] جلد ۱، ص ۵۲

Ibid., Vol: 01, P:52.

[7] جلد ۲، ص ۲۸۵

Ibid., Vol: 02, P:285.

[8] جلد ۱، ص ۱۸

Ibid., Vol: 01, P:18.

[9] جلد ۱، ص ۱۹

Ibid., Vol: 01, P:19.

[10] جلد ۳، ص ۱۹۶

Ibid., Vol: 03, P:196.

[11] جلد ۳، ص ۴۵۰

Ibid., Vol: 03, P:450.

[12] جلد ۲، ص ۸

Ibid., Vol: 02, P:8.

[13] جلد ۲، ص ۱۹۶

Ibid. Vol: 02, P:196.

[14] جلد ۱، ص ۱۸

Ibid. Vol: 01, P:18.

[15] جلد ۳، ص ۱۹۴

Ibid. Vol: 03, P:194.

[16] ایضاً

Ibid.

[17] جلد ۱، ص ۱۸

Ibid. Vol: 01, P:18.

[18] جلد ۳، ص ۵۱۸

Ibid. Vol: 03, P:21.

[19] جلد ۱، ص ۲۱

Ibid. , Vol: 01, P:21.

[20] جلد ۱، ص ۲۲

Ibid. , Vol: 01, P:22.

[21] جلد ۳، ص ۳۶۳

Ibid. Vol: 03, P:363.

[22] جلد ۱، ص ۵۳

Ibid. , Vol: 01, P:53.

[23] جلد ۱، ص ۷۷

Ibid. , Vol: 01, P:77.

[24] جلد ۲، ص ۷۳۳

Ibid. Vol: 02, P:733.

[25] جلد ۳، ص ۲۵۱

Ibid. Vol: 03, P:251.

[26] جلد ۱، ص ۲۶۱

Ibid. Vol: 01, P:261.

[27] جلد ۱، ص ۳۲۴

Ibid. , Vol: 01, P:324.

[28] جلد ۱، ص ۶۱۶

Ibid. , Vol: 01, P:616.

[29] جلد ۲، ص ۴۰۹

Ibid. Vol: 02, P:409.

30 جلد ۳، ص ۳۴۴

Ibid. Vol: 03, P:344.

31 جلد ا، ص ۷۲۵

Ibid., Vol: 01, P:725.

32 جلد ا، ص ۲۰

Ibid., Vol: 01, P:20.

33 جلد ا، ص ۷۴۱

Ibid., Vol: 01, P:741.

34 ایضاً

Ibid.

35 جلد ا، ص ۵۰

Ibid., Vol: 01, P:50.

36 جلد ا، ص ۱۶۰

Ibid., Vol: 01, P:160.

37 جلد ا، ص ۱۸

Ibid., Vol: 01, P:18.

38 جلد ا، ص ۵۲۰

Ibid., Vol: 01, P:520.

39 جلد ۳، ص ۱۰۷

Ibid. Vol: 01, P:107.

40 جلد ا، ص ۵۷۹

Ibid., Vol: 01, P:579.

41 جلد ا، ص ۳۶۰

Ibid., Vol: 01, P:360.

42 جلد ا، ص ۴۷۷

Ibid., Vol: 01, P:477.

43 جلد ا، ص ۱۴۷

Ibid., Vol: 01, P:147.

44 جلد ا، ص ۶۵۹

Ibid., Vol: 01, P:659.

[45] جلد ا، ص ٦٦٥

Ibid. , Vol: 01, P:665.

[46] جلد ۲، ص ۳۱٦

Ibid. Vol: 02, P:316.

[47] جلد ۲، ص ۱۳۹

Ibid. Vol: 02, P:139.

[48] جلد ا، ص ۲۹٦

Ibid. , Vol: 01, P:296.

[49] جلد ا، ص ۳۳٦

Ibid. , Vol: 01, P:336.

[50] جلد ۳، ص ۱۹٦

Ibid. Vol: 03, P:196.

[51] جلد ا، ص ۲۳۷

Ibid. , Vol: 01, P:237.

[52] جلد ۲، ص ۲۵۱

Ibid. Vol: 02, P:251.

[53] جلد ا، ص ۵۰۵

Ibid. , Vol: 01, P:505.

[54] جلد ۲، ص ۷۹۴

Ibid. Vol: 02, P:794.

[55] جلد ۲، ص ۴۹۱

Ibid. Vol: 02, P:491.

[56] جلد ۲، ص ۵٦۹

Ibid. Vol: 02, P:569.

[57] جلد ا، ص ۳۴٦

Ibid. , Vol: 01, P:346.

[58] جلد ۳، ص ۱۰٦

Ibid. Vol: 03, P:106.

[59] جلد ا، ص ۱۰۵

Ibid. , Vol: 01, P:105.

[60] ایضاً

Ibid.

[61] جلد ۱، ص ۱۹۵

Ibid., Vol: 01, P:915.

[62] جلد ۳، ص ۲۸۱

Ibid. Vol: 03, P:281.

[63] جلد ۲، ص ۳۴۴

Ibid. Vol: 02, P:344.

[64] جلد ۲، ص ۳۴۱

Ibid. Vol: 02, P:341.

[65] جلد ۲، ص ۳۴۳

Ibid. Vol: 02, P:343.

[66] جلد ۱، ص ۲۲۲

Ibid., Vol: 01, P:222.

[67] جلد ۲، ص ۱۶۶

Ibid. Vol: 02, P:166.

[68] جلد ۱، ص ۷۵۸

Ibid., Vol: 01, P:757.

[69] جلد ۱، ص ۶۵۹

Ibid., Vol: 01, P:659.

[70] جلد ۲، ص ۳۵۶

Ibid. Vol: 02, P:356.

[71] جلد ۲، ص ۷۸۵

Ibid. Vol: 02, P:785.

[72] جلد ۲، ص ۷۸۸

Ibid., Vol: 02, P:788.

[73] جلد ۱، ص ۶۸۴

Ibid., Vol: 01, P:684.

[74] جلد ۱، ص ۱۵۹

Ibid., Vol: 01, P:159.

[75] جلد ۲، ص ۱۲۱

Ibid. Vol: 02, P:121.

[76] جلد ا، ص ۴۱

Ibid. , Vol: 01, P:41.

[77] ایضاً

Ibid.

[78] جلد ا، ۷۵۱

Ibid. , Vol: 01, P:751.

[79] جلد ا، ص ۷۸

Ibid. , Vol: 01, P:78.

[80] جلد ا، ص ۸۱

Ibid. , Vol: 01, P:81.

[81] جلد ا، ص ۲۱۰

Ibid. , Vol: 01, P:210.

[82] جلد ا، ص ۶۸۵

Ibid. , Vol: 01, P:685.

[83] جلد ا، ص ۵۴

Ibid. , Vol: 01, P:54.

[84] جلد ۲، ص ۷۴۱

Ibid. , Vol: 01, P:741.

[85] جلد ا، ص ۳۸

Ibid. , Vol: 01, P:38.

[86] جلد ا، ص ۱۹۳

Ibid., Vol: 01, P:193.